افریقہ میں مُسلمانوں کا حال

(خلیل حامدی)

افریقہ میں مغربی استعمار کا داخلہ افریقہ میں مغربی استعمار کا آغاز پندرھویں صدی عیسوی کے اوائل سے شروع ہوتا ہے۔ ۱۴۱۵ء میں پرتگال نے مراکش کے شمالی ساحل پر سبطہ کی بندرگاہ پر قبضہ کیا۔ سبطہ، جبل الطارق کے بالمقابل طنجہ کے مشرق میں ایک چھوٹا سا مقام ہے جو رقبہ کے لحاظ سے اگرچہ معمولی تھا مگر حربی اور تجارتی حیثیت سے غیر معمولی اہمیت کا حامل تھا۔ پرتگال کی دیکھا دیکھی اسپین بھی اسی راہ پر چل پڑا۔ دونوں کے مقاصد ایک تھے۔ یعنی عالمی تجارت کا فروغ اور دنیا پر استعماری تسلط۔ شروع میں ان دونوں قوموں کے درمیان اَن بن ہو گئی۔ "پاپائے اعظم" ان دونوں عیسائی اقوام کے غلبہ سے خوش تھے مگر ان کی باہمی رقابت کو پسند نہ کرتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے مداخلت ضروری سمجھی اور رفع نزاع کے لیے سارے عالم کو ان دونوں میں تقسیم کر دیا جو تاریخ میں پاپائے اعظم کا فیصلہ (PAPAL BULL) کہلاتا ہے۔ اس فیصلہ کی رُو سے افریقہ پرتگال کو بخشا گیا اور اسپین کو نئی دنیا۔ اسی فیصلے کا یہ نتیجہ ہے کہ افریقہ میں اسپین کی بہت کم نوآبادیاں پائی جاتی ہیں۔ سولھویں صدی کے اختتام تک پرتگال اور اسپین ہی وہ ایسی یورپی سلطنتیں تھیں جو افریقہ اور مشرق کے دُور دراز ممالک پر اپنے فوجی اور تجارتی اڈے قائم کر رہی تھیں۔ سترھویں صدی کے آغاز میں ڈچ بھی آگے بڑھے۔ اور افریقہ، ہندوستان اور جزائر غرب الہند میں پہنچ گئے۔ جنوبی افریقہ کے کچھ علاقوں پر انہوں نے قبضہ کر لیا۔ جنوبی افریقی یونین کی دو ریاستوں (آرنج فری اسٹیٹ اور نٹال) میں جو بوئر سفید فام اقوام پائی جاتی ہیں وہ افریقہ میں ڈچ قوم کی بچی کھچی نشانیاں ہیں۔ موریشس، موزمبیق، کیپ ٹاؤن بھی ڈچ امپائر کے تحت تھا، مگر سیاسی تغیرات اور بین الاقوامی جنگوں میں افریقہ کے اندر ڈچ اقوام کا عمل دخل ختم ہو گیا۔ سترھویں

صدی کے اواخر میں انگریز اور فرانسیسی منڈیوں کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے۔ سنہ ۱۶۶۳ء میں انگلستان کے بادشاہ چارلس ولسن کی شادی جب پرتگالی شہزادی کیتھرائن سے ہوئی تو جہیز میں اُسے بمبئی کے ساتھ افریقہ میں طنجہ کی بندرگاہ بھی دی گئی۔ اس طرح ایشیا اور افریقہ میں انگریزوں کا داخلہ شروع ہوگیا۔ ادھر فرانس نے سنہ ۱۶۵۸ء میں سینی گال پر قبضہ سے اپنے استعمار کا آغاز کیا۔ الغرض پندرھویں صدی عیسوی میں ابتدا کرکے بیسویں صدی کے نصف اوّل تک یورپی اقوام براعظم افریقہ کے چپّہ چپّہ پر چھا گئیں۔

پچھلی قسط میں ہم بیان کرچکے ہیں کہ استعماری اقوام نے افریقہ میں اپنے داخلے کا آغاز افریقی انسان کی غلامی سے کیا۔ افریقہ کی آبادیوں کو ڈھور ڈنگروں کی طرح پکڑ پکڑ کر یورپ اور امریکہ اور دوسری نوآبادیوں میں بھیجا گیا۔ اور جب افریقہ کے بیشتر حصوں پر براہِ راست ان اقوام کا تسلط قائم ہوگیا تو انہوں نے پورے براعظم کو اپنے ظلم و ستم اور جبر و استبداد کی چکّی میں پیس ڈالا۔

افریقی آبادی کے ساتھ ظالمانہ برتاؤ

استعماری اقوام نے افریقیوں کو زندگی کے عام معاملات میں دوسرے درجہ کا انسان قرار دیا۔ اپنی آبادیوں کے اندر انہیں رہنے کی اجازت نہ دی۔ زندگی کے بہتر وسائل سے انہیں محروم کردیا۔ اچھی ملازمتوں کے دروازے ان پر بند کردیئے اور ہر قسم کی مراعات اُس شخص کے لیے مخصوص کی گئیں جو ان کے استعماری مقاصد کی تکمیل کرتا۔ افریقہ کی وحدت کو پارا پارا کیا۔ قبیلہ اور قبیلہ کے درمیان منافرت پیدا کرنے کی کوشش کی۔ ایک ہی نسل اور ایک ہی علاقہ سے تعلق رکھنے والے قبائل کو دو مختلف ملکوں میں بانٹ دیا۔ استعمار کا اصل مقابلہ چونکہ افریقہ کی مسلم اقوام سے تھا اور مسلم اقوام ہی استعمار کے تسلط کو روکنے کے لیے آخری دم تک استعماری اقوام سے برسرِپیکار رہیں اس لیے وہی استعمار کے خصوصی مظالم کا ہدف بنیں۔ مسلمانوں کو بجبر عیسائی بنایا گیا۔ ان پر تعلیم کے دروازے بند کردیئے۔ عربی زبان کی تعلیم ممنوع قرار دے دی۔ دینی شعائر کی ادائیگی پر پابندیاں عائد کردی گئیں۔ اور ان کی اکثریت کو اقلیت میں تبدیل کرنے اور اُسے تشدد و جبر کے ساتھ دبانے کی پوری کوشش کی گئی۔

آئیے ان تمام حقائق کو مصنف "تذکرہ افریقہ" کے بیانات کی روشنی میں دیکھیں۔ ٹوگو اپریل ۱۹۶۰ء

میں آزاد ہوا ہے۔ مصنف تذکرۂ افریقہ اس کی آزادی کی تقریب میں شامل ہوئے۔ ٹوگو کے دارالحکومت لومے میں ایک اسٹیڈیم کے اندر فوجی پریڈ ہوئی۔ مصنف اس میں شریک ہوئے۔ لکھتے ہیں:۔

”اسٹیڈیم کا ایک حصہ قبائلی سرداروں کے لیے مخصوص رکھا گیا تھا۔ نہ معلوم انہیں علیحدہ کیوں بٹھایا گیا۔ شاید اس لیے کہ ان کا دیہاتی تمدن کہیں سوٹ پہننے والوں پر گراں نہ گزرے۔ اگر ہمارا قیاس درست ہے تو ہم اسے کوتاہ اندیشی سے منسوب کریں گے۔ ایک ہی ملک میں دو مختلف تمدن اگر زیادہ عرصہ ایک دوسرے سے علیحدہ رکھے جائیں تو خطرناک رجحانات پیدا ہونے کا اندیشہ ہے۔“

ایک اور تقریب کا حال بیان کرتے ہوئے موصوف رقمطراز ہیں:۔

”آج شام گارڈن پارٹی میں قبائلی سرداروں کو ایک بار پھر قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ پارٹی وزیر اعظم کی طرف سے تھی۔ اور گورنمنٹ ہاؤس میں تھی۔ . . . وزراء پارلیمان کے ارکان اور غیر ملکی نمائندے سیڑھیوں کے اوپر دالان میں بٹھائے گئے . . . ہمیں اس بات پر تعجب ہوا کہ قبائل کو معزز شہریوں اور مہمانوں میں جگہ نہیں دی گئی۔ جب قبائلی سردار اپنے تخت و چتر سمیت پہنچتے تو مکان سے پچاس ساٹھ گز دُور ان کے چتر لگ جاتے اور تخت بچھا دیئے جاتے۔ دُور سے قبائلی سرداروں کو دیکھ چکے تھے۔ اب قریب جانے کا خیال ہوا۔ سیڑھیاں اتر کر اُن کی طرف گئے تو سب سے پہلی چیز جو نظر آئی وہ ایک تختی تھی جس پر لکھا تھا: ”دوسرے درجہ کے مہمان“۔ قبائلی سرداروں کو دوسرے درجہ کا شہری قرار دینا کہاں تک دُور اندیشی کہلا سکتا ہے۔“

نیجر کے تحت مصنف لکھتے ہیں کہ اس کی آبادی کا بیشتر حصہ مسلمان ہے اور قبائل جنگجو قسم کے ہیں۔ نیامی نیجر کا دارالسلطنت ہے۔ نیامی کی آبادی دو قسموں پر مشتمل ہے۔ ایک قسم وہ ہے جس میں محکوم طبقہ رہتا ہے اور دوسری قسم وہ ہے جو حکمرانوں کے لیے مخصوص ہے۔ اوّل الذکر طبقے کی آبادی کی نوعیت یہ ہے:

”پچانوے فی صد مکان کچی اینٹوں کے ہیں۔ کچی اینٹوں پر مزید مٹی سے لپائی کر دی جاتی ہے۔ مکانوں کی بلندی بھی زیادہ نہیں ہے۔ کچھ اس طرح کا احساس پیدا ہوتا ہے کہ پنجاب کے نہری

علاقے کے شہروں کی عمودی اور متوازی سڑکوں کے کنارے کچے مکانوں کی قطاریں بچھا دی گئی ہیں۔ اس قدر مکانوں کا باہم کم اونچائی کا ہونا کچھ عجیب سا لگتا ہے۔ بلکہ یوں محسوس ہوتا ہے کہ پورا شہر اس کی اردگرد کی ہر شے اور خود اس کا ماحول بھی پست قد ہو گیا ہے۔ شہر کا پست قد ہونا کبھی سوچا بھی نہ تھا۔ آج آنکھوں سے دیکھ لیا۔”

ثانی الذکر طبقے کی آبادی کا نقشہ یوں کھینچا ہے:

“جو سڑک امراء، وزراء اور افسروں کے لیے مختص کر دی گئی ہے وہ اس چھوٹے قد سے مستثنیٰ ہے۔ یہاں بنگلے ہیں، دفاتر ہیں، بلکہ محل بھی ہیں۔ اسی پر ہائی کمشنر کا دفتر اور اس کا دو منزلہ مکان ہے۔ اس کے بالمقابل بریگیڈیر کمان دار کا مکان بلند، محل نما اور کشادہ باغ میں گھرا ہوا ہے۔ صدر کابینہ کا مکان بھی اسی سڑک پر ہے۔”

سینی گال نے مسلمانوں کے ہاتھوں تہذیب کا جو عروج دیکھا ہے وہ پچھلے ابواب میں ہم بیان کر چکے ہیں۔ دورِ استعمار میں اس کی تہذیبی حالت کے خدوخال مصنّف تذکرۂ افریقیہ کی زبان سے ملاحظہ ہوں۔ سینی گال کے دارالحکومت ڈاکار کی حالت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

“آج بڑی سڑکوں سے ہٹ کر گلیاں دیکھیں۔ عالی شان عمارتوں کا پچھواڑا دیکھا۔ پہلی نظر میں جو ترقی، جدید رنگ اور نفاست دیکھنے میں آئی تھی اس کا سب اثر زائل ہو گیا۔ فرانسیسی آبادی بلکہ اس کے اعلیٰ طبقے اور ان کی یورپی طرز کی دکانوں سے ہٹ کر اگر شہر کو دیکھیں تو کافی کثافت ہے۔ اتنی بدبو تو ایشیا کے گنجان شہروں میں بھی نہیں ہوتی۔ عین شاہ راہ سے چند قدم پر کوڑے کرکٹ کے ڈھیر نظر آتے ہیں۔ ذرا دور چلے جائیں تو ٹین اور گھاس کے جھونپڑوں کا پورا شہر بستا نظر آتا ہے۔ . . . فرانسیسی شہر جو اب فرانسیسی نہیں رہا اس سے ملحق خالص افریقی شہر بھی ہے۔ نام ہے مدینہ۔ اس میں اکثر مکان پست قد اور ایک منزلہ ہیں۔ ساتھ ہی کچھ جھونپڑے بھی اُگ آئے ہیں۔”

مصنف نے یہی صورتِ حال نائیجیریا کے بارے میں بیان کی ہے۔ لاگوس جو نائیجیریا کا صدر مقام ہے

اس کے متعلق بیان کرتے ہیں کہ وہاں مسلمانوں کے مکانات مٹی اور ٹین کی جھونپڑیوں سے زیادہ نہیں ہیں۔ جبکہ شہر کے وہ حصے جن میں پختہ مکانات ہیں ان میں اکثر عیسائی رہتے ہیں۔

افریقی آبادی کے ساتھ یہ امتیازی سلوک استعمار نے ہر معاملے میں روا رکھا ہے۔ قانون میں، ملازمتوں میں، تجارت میں، سیاست میں غرضیکہ زندگی کے ہر شعبے میں اصل افریقی باشندے اچھوت بنا کر رکھ دیئے گئے۔

تعلیم اور ملازمت کے سلسلے میں جو امتیاز بلکہ دھاندلی وہاں کارفرما رہی ہے، وہ ذیل کے بیانات سے واضح ہو سکتی ہے:

ٹوگو کے تذکرہ میں مصنف لکھتے ہیں:

> ،، وزیرِ صنعت کے ہاں گئے۔ ان کا گھر کیا ہے: ٹین کی چھت کے بارک نما دو تین کمرے دالان میں ریت کا یہ عالم ہے کہ اس میں پاؤں دھنس جاتے ہیں ۔۔۔ جس طور طریقے پر سابق حکمرانوں نے یہ ملک چلایا تھا اس میں دیسی آدمیوں کے پاس قالین کہاں سے آتے۔ وہ تو زیادہ سے زیادہ تجارتی کمپنیوں کے کلرک یا حکومت کے ادنیٰ ملازم بن سکتے تھے۔ آب و ہوا کی وجہ سے یورپی باشندے یہاں مستقل طور پر آباد تو ہو نہ سکتے تھے، پھر ملک کو ترقی دینے سے کیا حاصل ہوتا۔ حکومت، انتظام، تعلیم، تجارت سبھی ان کی اپنی تحویل میں تھے۔ چند کلرک، چھوٹے دکاندار، نجی ملازم، ابتدائی اسکولوں کے استادوں کا کچھ حصہ، ہرکارے چپراسی اور ادنیٰ درجہ کے پادری، یہ تھیں وہ آسامیاں جن پر افریقی فائز ہو سکتے تھے۔ ممکن ہے دو چار ڈاکٹر یا دو ایک وکیل بھی موجود ہوں۔ ہم کسی ایسے شخص سے مل نہیں سکے۔ ،،

داہومی کی آبادی سترہ لاکھ انیس ہزار ہے۔ اس تعداد میں عیسائی اقلیت میں ہیں۔ مگر افسر، کلرک، مدرس سبھی عیسائی ہیں۔ پورٹو نووو شہر میں سول لائنز قسم کے علاقہ میں عیسائی بستے ہیں گنجان شہر میں مسلمان آباد ہیں:

نیجر پر جب فرانسیسی استعمار کا قبضہ ہوا تو اس وقت یہاں اکثریت مسلمانوں کی تھی۔ اور اس کی

سرحد جن سات ممالک سے ملتی ہے ان میں بھی اکثریت مسلمانوں کی ہے۔ مگر بقول مصنف تذکرۂ افریقہ: "نیجر کا کوئی باشندہ ابھی تک افسر کے عہدہ تک نہیں پہنچا"۔ نیجر کے دارالحکومت نیامی میں مصنف تذکرۂ افریقہ ایک کپتان سے اپنی ملاقات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "یہ صدر کابینہ و وزیر اعظم، کا ملٹری سکریٹری ہے۔ نام خالص فرانسیسی۔ باتوں باتوں میں معلوم ہوا کہ اس کے والد فرانسیسی تھے اور وہ خود فرانسیسی فوج میں کپتان ہے۔ نیجر کا کوئی باشندہ ابھی تک افسر کے عہدہ تک نہیں پہنچا اس لیے اس نیم افریقی افسر کو سوڈان سے یہاں لایا گیا ہے[1]"۔ سترہ، اٹھارہ لاکھ کی آبادی میں ایک افریقی بھی ایسا موجود نہیں ہے جو صدر کابینہ کی فوجی معاملات میں مدد کر سکے۔

اس کے ساتھ ہی مصنف یہ بھی بتاتا ہے کہ اقتصادیات کے ڈائرکٹر سے ان کی ملاقات ہوئی۔ یہ بھی فرانسیسی ہے۔ اور ذہنیت یہ ہے کہ جب مصنف نے اس فرانسیسی ڈائرکٹر اقتصادیات سے یہ دریافت کیا کہ اس وقت نیجر کے مویشی صرف گوشت کے لیے استعمال ہوتے ہیں، باہر سے دودھ والی نسل منگا کر اس پہلو کو ترقی کیوں نہیں دی جاتی؟ فرانسیسی ڈائرکٹر اقتصادیات جواب میں کہتا ہے کہ: "یہ کام ہم جب کریں کہ گوشت سے کافی آمدنی نہ ہو جاتی ہو۔ ایسے میں ہم دوسرے ذریعۂ آمدنی کی طرف کیوں متوجہ نہ ہوں؟" مصنف نے پوچھا کہ دودھ مکھن اور پنیر کے لیے کیا کرتے ہیں؟ وہ کہنے لگا کہ "دیہات میں کچھ نہ کچھ مویشیوں سے حاصل ہو جاتا ہے اور شہروں میں اور فوج کے لیے فرانس سے آجاتا ہے"۔ مصنف تذکرہ اس گفتگو کو نقل کرنے کے بعد خود ہی لکھتے ہیں کہ "اب ہم سمجھے کہ نیجر میں دودھ والی نسل کی افزائش کیوں نہیں کی گئی"۔ اسکے ساتھ مصنف نے یہ بھی لکھا ہے کہ: "منصوبہ بندی کے ڈائرکٹر سے ملاقات ہوئی۔ یہ بھی فرانسیسی ہے۔ ابھی تک کوئی منصوبہ تیار نہیں ہوا۔ ہم نے دریافت کیا کہ دریائے نیجر پر بند باندھ کر آبپاشی کا کوئی منصوبہ زیر غور ہے؟ کہنے لگے کہ اس پر غور نہیں کیا گیا۔ کچھ رک کر کہا کہ اس ملک میں آبپاشی سے کچھ حاصل نہ ہوگا۔ ہم اس جواب کو نہ سمجھ سکے۔ ملک میں تانبا بہت بتاتے ہیں مگر روپے کی کمی کی وجہ سے اس کو نکالنے کا منصوبہ تیار نہیں کیا جا سکا۔ جس ملک میں میز، کرسی، الماری، پلنگ، سوئی، تاگہ، پھولوں کے گملے، اور پینے کا پانی سمندر پار سے درآمد کیے جا رہے ہوں وہاں

---

[1] بلکہ خود مصنف کی تحقیق یہ ہے کہ پورے مغربی افریقہ میں کوئی افریقی آج تک کپتان کے عہدے سے اوپر نہیں پہنچا۔

ترقیاتی منصوبوں کا چلانا تو کجا ان پر غور کرنے کی استعداد بھی پیدا نہیں ہو سکتی۔“

مغربی افریقہ کا ملک بالائی وولٹا ۱۹۵۵ء میں معرضِ وجود میں آیا ہے۔ تین ملکوں یعنی نیجر، مغربی سوڈان اور سینی گال سے تھوڑا تھوڑا علاقہ کاٹ کر ایک نیا ملک بنا لیا گیا ہے۔ ان تینوں ملکوں میں مجموعی طور پر مسلمانوں کی اکثریت تھی۔ وسطی علاقہ میں جسے اب بالائی وولٹا کا نام دیا گیا ہے ارواح پرست زیادہ تھے۔ اور اس خطہ میں عیسائی مشنوں کو نسبتہً کامیابی ہو چکی تھی، اس لیے یہاں کے باشندوں کو مسلمانوں کے تحت رکھنا پسند نہ کیا گیا۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ اب بھی وہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے اور اس کے باوجود وزیر اعظم اور حکومت کے تمام افسر عیسائی ہیں۔

مسلمانوں کو ختم کرنے کی اسکیم

افریقہ کی مسلمان آبادیوں کے ساتھ استعماری اقوام نے دوسرے تمام افریقیوں سے زیادہ تعصب اور تشدد برتا ہے۔ مسلمانوں کو زندگی کے تمام وسائل سے محروم کر دیا گیا۔ اور انہیں بجبر عیسائی بنانے کی کوشش کی گئی۔ ایک طرف ملک کا پورا نظم ونسق استعماری حکام نے اپنے ہاتھ میں لے لیا اور زندگی کے تمام وسائل پر اپنی اجارہ داری قائم کر لی۔ اور دوسری طرف تعلیم کا پورا نظام عیسائی مشنریوں کے ہاتھ میں دے دیا تاکہ وہ تعلیم کے پردے میں عیسائیت کا جال پوری طرح پھیلا سکیں۔ عیسائی مشنریوں نے تعلیم کے دروازے عام افریقیوں پر بالعموم اور مسلمانوں کے لیے بالخصوص بند کر دیئے اور صرف ان لوگوں کو تعلیم گاہوں میں قدم رکھنے کا پرمٹ دیا جو عیسائیت کو قبول کریں، یا کم ازکم اپنا نام عیسائیوں کا سا رکھ لیں۔ اس شرط کے بعد مسلمانوں کے لیے صرف دو ہی راستے رہ گئے۔ یا وہ اپنا دین بچانے کی غرض سے تعلیم سے اپنے آپ کو محروم کر لیں اور ہمیشہ کے لیے اپنا مستقبل ختم کر لیں۔ یا پھر کم ازکم نام کے عیسائی بن کر تعلیم حاصل کریں اور اس طرح ملک کے نظم ونسق میں دخیل ہو سکیں۔ مگر اس صورت میں اس امر کی کیا ضمانت ہے کہ جو آج تعلیم کی خاطر اپنا نام بدل سکتا ہے کل وہ ملازمت کی خاطر اپنا دین وعقیدہ بدل لینے میں تأمل کرے گا۔ چنانچہ افریقہ کے مسلمانوں نے ان دونوں راستوں میں سے جو راستہ بھی اختیار کیا ہے وہ ان کے لیے سخت نقصان دہ اور خطرناک ثابت ہوا ہے۔ اور اس کا وہی نتیجہ برآمد ہوا جو استعمار کے پیش نظر تھا۔

جو مسلمان تعلیم کی خاطر اپنا عیسائی نام رکھ کر اسکولوں میں داخل ہوئے ہیں آج ان کی کیفیت تذکرۂ افریقہ کے مندرجۂ ذیل اقتباسات سے معلوم کی جا سکتی ہے:

"ٹوگو کے دارالحکومت لومے میں، مقامی عالمِ دین محمد یحییٰ سے پوچھا کہ مسٹر اسٹائن کون ہے؟ مولانا نے فرمایا: عیسائی تھا اب کہتا ہے کہ مسلمان ہے عیسائی مشن اسکول میں تعلیم حاصل کرنے کی وجہ سے اپنے نام کے ساتھ اسٹائن کا اضافہ کر چکا ہے اور شرع کا پابند نہیں رہا۔"

"مولانا محمد یحییٰ کی زبانی ہی معلوم ہوا کہ چونکہ یہاں پر سرکاری مدارس نہیں تھے اس سبب جو مسلمان مشن اسکولوں میں داخلہ لیتے تھے انہیں عیسائی نام بھی اختیار کرنا پڑتا تھا۔ گو عملی طور پر وہ عیسائیت قبول نہیں کرتے تھے۔ مگر مسلمان برادری انہیں مسلمان سمجھنا ترک کر دیتی تھی۔"

"داہومی کے دارالحکومت پورٹو نووو میں، آج پھر جامع مسجد جانے کا اتفاق ہوا۔ امام صاحب سے مسلمانوں کے اعداد و شمار دریافت کیے تو کچھ حاصل نہ ہوا۔ وزراء کے متعلق پوچھا [illegible] وزیر مسلمان ہے۔ ان کے ساتھی نے کہا کہ دو ہیں۔ اس پر وہ خفا ہو گئے کہ دوسرا تو پابند [illegible] نہیں اور شراب پیتا ہے۔" (اس اختلاف کی تہ میں بھی وہی وجہ کارفرما ہے کہ جس شخص نے تعلیم کے زمانے میں اپنا عیسائی نام رکھ لیا ہے اس کے بارے میں مسلمان شک میں مبتلا ہو گئے کہ وہ مسلمان بھی رہا یا نہیں۔ اور چونکہ اس کی اجتماعی زندگی میں اسلام کا کوئی اثر موجود نہیں ہے اس لیے یہی سمجھا جاتا ہے کہ وہ اسلام کو کلیتہً ترک کر چکا ہے)۔

نائیجر کے دارالحکومت نیامی میں، "شام کا کھانا وزیر اعظم کی طرف سے تھا۔ کھانے کے دوران فرانسیسی لیفٹیننٹ کرنل سے پوچھا کہ وزیر اعظم کا مذہب کیا ہے۔ پہلے تو کہا کہ مسلمان ہے۔ پھر کہنے لگا کہ آدھا مسلمان ہے اور آدھا ارواح پرست۔ جب میں نے کہا کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے تو مسکرا پڑا اور کہا "بس یوں بھی ہوتا ہے۔ یہ کچا پکا سا مسلمان ہے"۔"

نامور مسلمان رہنما کے ساتھ بدسلوکی

مغربی افریقہ کی تاریخ میں موسیٰ خاندان نہایت مشہور و معروف خاندان

ہے۔ تیرھویں صدی میں اس خاندان کا سربراہ مسلمان ہو گیا تھا۔ ابوبکر اس کا نام تھا۔ اور وہ موسٹی قبیلہ کا بادشاہ تھا۔ اس بادشاہ کا پوتا جسے آج بھی قبیلہ کے لوگ بادشاہ تسلیم کرتے ہیں آج بالائی وولٹا کے دارالحکومت میں رہتا ہے۔ مصنف تذکرۂ افریقہ نے ان سے ملاقات کی ہے۔ وہ بیان کرتے ہیں کہ ان کا قبیلہ داہومی، نیجر، بالائی وولٹا، ٹوگو اور گھانا میں بٹ گیا ہے۔ ان کے قبیلہ کے لوگ کچھ عیسائی ہو گئے۔ مسلمانوں کی تعداد عیسائیوں سے زیادہ ہے۔ مگر سرکاری اعداد و شمار میں عیسائیوں کو زیادہ اور بعض دفعہ مسلمانوں کے برابر بتاتے ہیں۔ مصنّف کا بیان ہے :

”اس بادشاہ کے متعلق عجیب و غریب باتیں سننے میں آئیں۔ ایک فرانسیسی افسر کی زبانی معلوم ہوا کہ وہ نیم مسلمان ہے۔ دوسرے نے کہا کہ اس کے گھر والے تو مسلمان ہیں مگر وہ ارواح پرست ہی ہے۔ ایک اور نے لقمہ دیا کہ وہ کچھ بھی نہیں ہے۔ چونکہ اس کا قبیلہ بہت بڑا اور بکھرا ہوا ہے اور ہر مذہب سے متعلق ہے اس لیے وہ بھی اپنا مذہب بدلتا رہتا ہے جو عیسائی یا مسلمان ہو چکے ہیں وہ بھی زمانۂ جاہلیت کی رسوم کی پابندی کرتے ہیں۔ اور یہ خود اُن رسوم کی صدارت کرتا ہے اس لیے اسے تو ارواح پرست ہی کہنا چاہیے۔ ایک اور نے لقمہ دیا کہ وہ تو ماہِ رمضان کے روزے بھی پابندی سے رکھتا ہے۔ جواب ملا ہاں، مگر مسلمان رعیت کو خوش کرنے کے لیے۔“

اس بادشاہ کی تعلیم فرانس کی ہے۔ ان کے پاس اختیارات کچھ نہیں ہیں۔ ان کے قبیلے کی کل تعداد بیس لاکھ سے زائد ہے۔ قبیلہ ان کی بات مانتا ہے۔ بادشاہ نے مصنف تذکرۂ افریقہ کو ملاقات کے دوران بتایا کہ ”حکام اس بات کو پسند نہیں کرتے کہ میں مسلمانوں سے میل جول رکھوں۔“

اس بادشاہ کے اپنے قبیلہ پر اثرات دیکھ کر فرانسیسی استعمار کو یہ خدشہ لاحق رہا کہ اگر اسے مسلمانوں سے ملنے جُلنے دیا گیا تو اس سے مسلمانوں کے اندر فرانسیسیوں کے خلاف تحریک اٹھ کھڑی ہو گی۔ اس لیے ایک طرف اس کے مسلمانوں سے میل ملاپ رکھنے پر پابندیاں لگا دیں اور دوسری طرف مسلمانوں کے اندر اُس کے بارے میں یہ شکوک و شبہات پھیلائے گئے کہ وہ اسلام کو ترک کر چکا ہے یا وہ ارواح

پرستوں کا ساتھ دیتا ہے تاکہ اُس کا اخلاقی دبدبہ مسلمانوں کے دلوں سے ختم کیا جا سکے۔ مصنف تذکرۂ افریقہ نے یہ بھی لکھا ہے کہ اس سال بادشاہ کا فرانس جانے کا پروگرام ہے۔ ڈیگال نے دعوت نامہ بھیجا ہے۔ اور جب کبھی وہ فرانس جاتے ہیں تو سرکاری مہمان خانے میں ٹھیرتے ہیں۔ مصنف نے بادشاہ کو پاکستان کی سیر کی دعوت دی۔ مگر وہ کہنے لگے کہ "حکومت ان کا باہر نکلنا پسند نہیں کرتی۔ اگر پاکستان کی حکومت کی طرف سے یہ تجویز پیش ہو تو شاید مقامی (فرانسیسی) حکومت اجازت دے دے"۔

"یوم افواج" کی تقریب میں ڈپٹی ہائی کمشنر کی طرف سے استقبالیہ دیا گیا۔ مصنف تذکرۂ افریقہ اس استقبالیہ میں شریک ہوئے۔ لکھتے ہیں، ایک پروفیسر سے ملاقات ہوئی۔ جو موسی قبیلہ کے فرد ہیں۔ مَیں نے اُن سے اُن کے مذہب کے بارے میں پوچھا تو بتایا کہ وہ مشن کی طرف سے فرانس میں تعلیم کے لیے گئے تھے اور حال ہی میں چودہ سال کے بعد لوٹے ہیں۔ کہنے لگے: "اب تو میں رومن کیتھولک ہوں"۔

مزید لکھتے ہیں:۔

"تین پادری بھی اس تقریب میں موجود تھے اور مقامی جامع مسجد کے امام صاحب بھی۔ یہ پہلا موقع ہے کہ ہم نے کسی رسمی تقریب میں مسلمان عالم کو مدعو پایا ہے۔ ممکن ہے یہ بھی آزادی کی برکت ہو"۔

"بادشاہ سلامت کا اس محفل میں بھی چرچا رہا۔ دو تین فرانسیسی افسروں نے خاص طور پر پوچھا کہ بادشاہ سلامت سے کیا باتیں ہوئیں۔ ہم نے کہا کہ پاکستان سے متعلق باتیں ہوتی رہیں۔ ایک صاحب کہنے لگے کہ بہت ڈرتا ہے۔ دل کی بات نہیں بتاتا۔ ممکن ہے وہ فطرتاً ڈرپوک ہو مگر جس طرح ہم سے باتیں ہوئیں ہم تو یہی کہیں گے کہ وہ مصلحتاً اپنے اسلام کو ظاہر نہیں ہونے دیتا۔ جس کے ملازم اور وزیر مسلمان ہوں، جس کے آباؤ اجداد مسلمان ہوں، جس کے اقربا مسلمان ہوں اور جو کہتا ہو کہ مسلمانوں سے اس لیے تعلق نہیں رکھتا کہ حکام اس بات کو پسند نہیں کرتے تو پھر ماننا پڑتا ہے کہ اس کا مذہب کے معاملہ میں اپنے آپ کو غیر جانب دار

اور غیر متعلق رکھنا محض وقتی بات ہے۔“

مصنف بالائی وولٹا کے ایک مقام کا گا ڈوگو میں گئے۔ وہاں کے کمان دار کے ہاں ٹھیرے۔ کمان دار نے، ان کے اعزاز میں دعوتِ طعام کا اہتمام کر رکھا تھا۔ لکھتے ہیں:

”یہاں جو قبائلی سردار جمع تھے ان میں سے اکثر مسلمان ہیں۔ فرانسیسی ضابطۂ ارتباط سے کمان دار کے مذہب کے متعلق پوچھا تو جواب ملا کہ کسی کو معلوم نہیں۔ اب اس ”معلوم نہیں“ اور ”کچھ نہیں“ کا مفہوم ہم سمجھتے جا رہے تھے۔ عیسائیت کو چھپانے کے تو کوئی معنی ہی نہ تھے۔ یہ تو حکام کا مذہب رہا ہے۔ ارواح پرستی آبائی رسوم کا نام ہے۔ لہٰذا اسے کیوں چھپایا جائے۔ اگر کوئی مذہب چھپایا جانا چاہیے تو وہ اسلام تھا جس سے حکامِ وقت کو چڑ تھی... اس لیے جو شخص مذہب کو چھپاتا ہے اس کا تعلق صرف اسلام سے ہی ہو سکتا ہے۔ چونکہ تعلیم حاصل کرتے وقت اسے چھوڑ دیا تھا۔ اب یکلخت کھلّا واپسی میں لامحالہ دیر لگے گی۔“

مالی کے نائب صدر کے بارے میں مصنف نے لکھا ہے کہ ان کا نام عیسائی ہے مگر ہیں مسلمان۔ تعلیم کے زمانے میں مشن اسکول کے پادریوں نے عیسائی نام دے دیا تھا جو اب تک چلا آتا ہے۔

عربی زبان اور دینی تعلیم پر پابندی مسلمانوں کو دین سے بے بہرہ کرنے کے لیے استعمار نے دوسرا حربہ اختیار کیا کہ عربی زبان کی تعلیم کو ممنوع قرار دے دیا۔ الجزائر پر فرانس نے سوا سو سال تک حکومت کی ہے۔ اس پورے عرصہ میں فرانسیسی حکمرانوں نے عربی زبان کو ختم کرنے کے لیے ہر طرح کی کوششیں کیں۔ عربی زبان الجزائر کی اصل زبان تھی، مگر اُسے زندگی کے ہر میدان سے اس طرح خارج کیا گیا کہ اُس کے یکسر مٹ جانے کا خطرہ پیدا ہو گیا۔ خصوصاً وہاں کے جدید تعلیم یافتہ بڑی بڑی شخصیتوں کا حال یہ ہے کہ وہ عربی لکھنے اور بولنے پر قادر نہیں ہیں۔ اور بسا اوقات انہیں مترجم کی ضرورت پیش آتی ہے جو فرانسیسی سے ان کی بات کا عربی ترجمہ کریں۔ اس صورتِ حال کو دیکھ کر الجزائر کے مسلمان رہنماؤں نے اپنی تمام تر کوششیں عربی زبان کے احیاء پر مرتکز کر دیں اور یہ زبان مٹتے مٹتے بمشکل بچی۔ افریقہ کے دوسرے ممالک میں بھی استعمار نے عربی زبان کے ساتھ یہی برتاؤ کیا ہے۔ مصنف مذکورہ افریقہ سینی گال کے حالات

کے تحت لکھتے ہیں:-

"یہاں ڈاکار کے سب سے بڑے مسلمان عالم سے ملاقات ہوئی۔ وہ ماضی کا ذکر کرتے ہوتے کہنے لگے کہ فرانس نے عربی کی تعلیم ممنوع کر رکھی تھی۔ قرآن پڑھا اور پڑھایا جا سکتا تھا۔ (یعنی ویسے ہی قرآن پڑھایا جا سکتا تھا جیسے ہندوستان میں عام مسلمان بے سوچے سمجھے اسے پڑھتے ہیں) ... ڈاکار کے امام اعظم سے ملنے گئے۔ ان کا نام الحلج امادو لامینے دینے ہے۔ یعنی الحاج احمد الامین الدین۔ امام اعظم ہونے کے علاوہ کورٹ آف اپیل کے رکن بھی ہیں۔ انہوں نے بھی اس بات کی تصدیق کی کہ فرانسیسی حکام نے عربی کی تعلیم ممنوع قرار دے رکھی تھی۔ صرف قرآن پڑھا سکتے تھے۔ اس کے لیے بھی گورنر جنرل کی اجازت لازمی ہوتی تھی"۔ ... مولانا سے ملاقات کر کے لوٹے تو الحاج ابراہیم ایوب سے ملے۔ آپ کو یہاں کا راجہ یا نواب سمجھتے ہیں۔ ہز ہائی نس کے برابر کا خطاب ہے۔ باقی نعمات کی تفصیل بھی آدھے صفحہ پر آتی ہو گی۔ جب فرانسیسی آئے تو ان کے پردادا ڈاکار کے سردار یا بادشاہ تھے۔ انہوں نے ۱۸۵۷ء میں فرانسیسیوں کے ساتھ دوستانہ معاہدہ کیا تھا۔ کہنے لگے کہ حال ہی میں ہز ہائی نس نے جب قرآنی مدرسہ کھولنے کی اجازت چاہی تو فرانسیسی گورنر جنرل نے اجازت دینے سے انکار کر دیا۔ اس پر یہ بہت بگڑے اور کہا میرے دادا نے تو تمہیں یہاں پر لنگر انداز ہونے کی اجازت دی تھی، اب تم مجھے قرآنی مدرسہ تک کھولنے سے روکتے ہو"۔

عربی اور قرآنی تعلیم کے ساتھ تو یہ کم ظرفی دکھائی گئی حالانکہ مسلمانوں کی اکثریت اسے بولتی اور سمجھتی تھی، مرابطی مجاہدوں کی کوششوں سے اسے علم و ادب کی زبان کا مقام حاصل تھا۔ مقامی زبانوں کے بعد اگر کسی زبان کو فوقیت حاصل تھی تو وہ عربی ہی تھی۔ اب دیکھیے کہ جن زبانوں کو فروغ دیا گیا وہ کونسی تھیں۔ اس کے متعلق مصنّف تذکرۂ افریقہ لکھتے ہیں:

"آج سینیگال کی وزارتِ تعلیم کے سکرٹری سے بھی ملاقات ہوئی۔ فرانسیسی ہیں۔ سینیگال کی وزارتِ تعلیم کی تحویل میں صرف ابتدائی اور ثانوی تعلیم ہے۔ یونیورسٹی وفاقی وزارتِ

تعلیم کے ہاتھ میں ہے۔ معلوم ہوا کہ ابتدائی مدارس میں صرف فرانسیسی پڑھائی جاتی ہے ثانوی جماعتوں میں دیگر مضامین کے علاوہ چار زبانیں اور بھی پڑھائی جاتی ہیں۔ دو پہلے درجہ کی سمجھی جاتی ہیں اور دو دوسرے درجہ کی۔ ہر درجہ کی ایک زبان پڑھنی ہوتی ہے۔ پہلے درجہ کی انگریزی اور جرمن ہیں۔ دوسرے درجہ میں ہسپانوی اور اطالوی ہیں"۔

ان حالات کے باوجود جن لوگوں نے عربی زبان کو اپنے سینے سے لگائے رکھا ہے اُنہیں "ان پڑھ" افراد کی فہرست میں رکھا گیا۔ مصنف مالی کے وزیر تعلیم سے گفتگو کے بعد اپنے تاثرات بیان کرتے ہوئے بتاتے ہیں:

"جب سے یورپی زبانیں سرکاری زبان کا درجہ اختیار کر چکی ہیں اس وقت سے عربی پڑھے لکھے لوگ "ان پڑھوں" میں شامل ہو گئے ہیں۔ جب عربی کو اقتصادی اور انتظامی امور سے خارج کر دیا گیا تو اس کی اہمیت کے ساتھ ساتھ اس کی استعداد بھی کم ہوتی گئی۔ یہاں بھی تقریباً یہی حال ہوا۔ فرانسیسی سوڈان میں عربی زبان رائج تھی۔ فرانس کے آنے پر عربی کو انتظامیہ سے خارج کر دیا گیا۔ چھوٹے موٹے دکانداروں کے لین دین کی زبان شاید رہ گئی ہو ورنہ اسے تجارت سے نکال دیا گیا۔ اب سرکاری زبان فرانسیسی ہے"۔

مذہبی شعائر پر پابندی مذہبی سرگرمیوں اور مذہبی شعائر پر پابندی لگا دی گئی۔ بریگیڈیر گلزار احمد صاحب نے ڈاکار کے امام اعظم کی جو گفتگو تذکرۂ افریقہ میں نقل کی ہے وہ بلاشبہ ایک ایسے شخص کے احساسات ہیں جو بذات خود استعمار کے مظالم کا نشانہ بنا رہا ہے۔ امام اعظم کا بیان ہے:

"اسلامی قومیت کا احساس دلوں میں ضرور ہے مگر اسے زبان تک لانا جرم سمجھا جاتا تھا۔ حکومت نے مسلمانوں کی تنظیم پر اس قدر پابندی لگا رکھی تھی اور شیرازہ اتنا منتشر کر رکھا تھا کہ خاتمہ بالخیر کے ماوراء انسان سوچ بھی نہ سکتے تھے۔ ان ممالک کے مسلمان بڑی دقتوں اور صعوبتوں کے بعد حج سے فیضیاب ہوتے اور جب وہاں دیکھتے کہ عرب ملکوں میں بھی اسلامی قومیت کو دقیانوسی خیال سمجھا جاتا ہے تو اگر یہ بھی اسی رَو میں بہ جاتے تو مقام

تعجب نہ تھا:

بالائی وولٹا کے ایک خاندانی بادشاہ کا تعارف ہم اوپر نقل کر آئے ہیں۔ انہی بادشاہ صاحب نے مصنف تذکرۂ افریقہ کو باتوں باتوں میں بتایا کہ:

> "ان کے چچا دو سال ہوئے حج کے لیے گئے تھے۔ اب تک خرطوم سے آگے نہیں گئے۔ روپوں کی کمی آگئی تو وہیں رک گئے۔ انہوں نے یہاں سے روپے روانہ کرنے چاہے مگر حکومت نے زرِ مبادلہ دینے سے انکار کر دیا۔"

دیکھیے، استعماری حکومت یہ اس شخص کے ساتھ سلوک کر رہی ہے جس کا خاندان اس سرزمین پر حکمران رہا ہے اور آج بھی وہ بیس لاکھ افراد پر مشتمل قبیلے کا مکھیا ہے۔ حج کی اجازت اگر بمشکل دی جاتی ہے تو زرِ مبادلہ کافی نہیں دیا جاتا، اور اگر روپیہ راستے میں ختم ہو جاتا ہے، تو مزید روپیہ بھیجنے کی اجازت نہیں دی جاتی۔ یہ ہے استعمار کا وہ انسانیت سوز رویّہ جو اس نے افریقہ کے مسلمانوں کے ساتھ روا رکھا۔ اس کے بعد ان مغربی اقوام کا کیا منہ ہے کہ وہ دوسروں کو مذہبی رواداری کا درس دیں۔ اور کس قدر بے وقوف ہیں وہ لوگ جو ان سے درس لے کر ان سے بے تعصبی کا سرٹیفکیٹ حاصل کرنے کے لیے دینی معاملات میں بے حسی کا مظاہرہ کریں

روانڈا اروندی کے مسلمانوں پر مظالم روانڈا اروندی میں بلجین گورنمنٹ نے وہاں کے مسلمانوں پر جو مظالم توڑے ہیں اس کی تفصیل ہم روانڈا اروندی کی انجمن اسلامی کے ایک میمورنڈم سے پیش کرتے ہیں:۔

> "بلجین گورنمنٹ افریقی عیسائیوں کو مسلمانوں کے خلاف بھڑکاتی رہتی ہے۔ اس کے نتیجے میں وہاں کئی مرتبہ فسادات ہو چکے ہیں جن میں مسلمانوں کی کثیر تعداد موت کے گھاٹ اتر چکی ہے۔ اور بہت بڑی تعداد جیلوں میں ڈالی جا چکی ہے۔ اور اب مسلمانوں کو بالجبر عیسائی بنایا جا رہا ہے۔ گسٹیو شہر میں ایک مسلمان مبلّغ کو گرفتار کر لیا گیا اور اُسے مقدمہ چلائے بغیر نظر بند کر دیا گیا۔ اور جب ایک مدت کے بعد اُسے رہا کیا گیا اور اس نے اپنی گرفتاری

کی وجہ دریافت کی تو جواب میں آسے ملک سے نکال دیا گیا۔ مسلمانوں کی املاک ضبط کر لی گئی ہیں اور انہیں افریقی عیسائیوں کی تحویل میں دے دیا گیا۔ مسلمانوں کو ملک کے ایک محدود علاقہ میں محصور کر دیا گیا ہے۔

تمام مسلمانوں کو تعلیم سے محروم کر دیا گیا ہے۔ روانڈا اُرونڈی کی سرکاری زبان فرانسیسی ہے لیکن چند مسلمانوں کے سوا ان میں اس زبان کو جاننے والا کوئی نہیں ہے۔ مسلمان کو اس شرط کے ساتھ اسکول میں داخلہ دیا جاتا ہے کہ وہ عیسائیت کو اختیار کر لے۔ مسلمانوں نے اس خطرناک صورتِ حال کو دیکھ کر اپنا ایک مدرسہ جاری کرنے کی اسکیم تیار کی۔ اور بڑی مشکلات کے بعد ایک مدرسہ جاری کیا گیا۔ مگر بلجین گورنمنٹ نے ایک آرڈی ننس کے ذریعہ اس مدرسہ کو سمار کروا دیا۔ مسلمانوں نے اس پر سخت احتجاج کیا مگر صدا بصحرا ثابت ہوا۔ مسلمانوں کو نماز جنازہ ادا کرنے سے منع کیا جا رہا ہے۔ حکومت مجبور کر رہی ہے کہ مسلمان کیتھولک مذہب کے مطابق جنازہ اور تدفین کے مراسم انجام دیں۔ چنانچہ متعدد مسلمان کیتھولک عیسائیوں کے ہاتھ سے دفن کیے جا رہے ہیں اور جب ان کے مراسم تدفین ادا کیے جاتے ہیں تو پولیس اور فوج کا سخت پہرہ لگا دیا جاتا ہے۔ موسیٰ کابیرجی نامی ایک مسلمان کو وہاں کے مسلمانوں نے اپنے طریقے پر دفن کر دیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ متعدد مسلمان گرفتار کر لیے گئے اور اُن پر بھاری جرمانے عائد کیے گئے۔

حکومت کے افراد اور عیسائی کارکن کئی مرتبہ مسلمانوں کے گھروں میں گھس گئے ہیں۔ اور لوٹ مار کا بازار گرم کیا ہے۔ مسلمانوں کی مساجد کو اور قرآن شریف کے نسخوں کو نذرِ آتش کیا ہے۔ مسلمانوں کی املاک اور اراضی کو حکومت کیتھولک فرقے میں تقسیم کر رہی ہے اور مسلمانوں کے لیے اقتصادی اور تعلیمی لحاظ سے وہاں جینا مشکل ہو گیا ہے۔

۱۹۶۱ء کے انتخابات میں حکومت نے ایک ایسی سیاسی پارٹی کو انتخاب میں شرکت کرنے کی اجازت دے دی جس نے علی الاعلان اپنا یہ مقصد بیان کیا کہ وہ مسلمانوں کو اس ملک سے

نکال پھینکے گی۔ حکومت نے اس پارٹی کی پوری پشت پناہی کی اور اُس نے مسلمانوں کی بستیوں میں تخریبی کارروائیوں کا آغاز کر دیا۔ رواگانا نامی ایک قصبے میں اس پارٹی کے کارکنوں نے خونریز فسادات برپا کیے۔ وہاں کی مسجدوں کو منہدم کر دیا۔ اور کئی مسلمانوں کو موت کے گھاٹ اُتار دیا۔ اور یہ نعرے لگاتے رہے کہ "اے مسلمانو! کہاں ہے تمہارا محمد (صلی اللہ علیہ وسلّم) اُسے اپنی مدد کے لیے بلاؤ۔" ۴ر دسمبر ۱۹۶۱ء کی بات ہے کہ کارمبو شہر میں مسلمانوں کو یکایک قتل و غارت کرنا شروع کر دیا گیا اور جب مسلمانوں نے بلجین گورنمنٹ سے اس پر واویلا کیا تو گورنمنٹ کے اشارے سے مسلمانوں کے گھروں کو آگ لگا دی گئی۔"

چاڈ پر مظالم

چاڈ وسط افریقہ میں ۹۴ فی صدی مسلم اکثریت کا ملک ہے۔ ماضی میں یہاں کے باشندوں نے اسلام کی بڑی خدمات سرانجام دی ہیں۔ فرانسیسی استعمار نے ۱۸۹۰ء میں اس پر حملہ کیا اور ۱۹۱۲ء میں اس ملک پر اس کا قبضہ مکمل ہوا۔ اس کے بعد فرانس نے یہاں کی مسلم آبادی کے ساتھ جو سلوک کیا اس کی ایک ہلکی سی جھلک خود فرانسیسی ہائی کمشنر کے ملٹری سکرٹری کے اس بیان میں دیکھیے جو مصنف "تذکرۂ افریقہ" نے براہِ راست اس کی زبان سے سُن کر نقل کیا ہے :-

„چاڈ کی با اقتدار پارٹی کے علاوہ یہاں بایاں بازو بھی موجود ہے۔ اس کی رہبری مسٹر گومبا کر رہا ہے۔ یہ گروہ نوجوانوں پر مشتمل ہے اور فرانس کے خلاف ہے۔ اس پارٹی کی سب سے بڑی شکایت یہ ہے کہ فرانس نے یہاں زیادہ مظالم کیے ہیں۔ پھر خود ہی کہنے لگا (یعنی ملٹری سکرٹری) کہ حقیقت یہی ہے کہ فرانس نے یہاں بہت زیادہ ظلم و تشدد کیا۔ پورے افریقی مقبوضات کے مقابلہ میں یہاں کی آبادی کے ساتھ مظالم زیادہ ہوئے ہیں۔ انیسویں صدی کے اواخر میں جب فرانسیسی یہاں آئے تو ان کا مقصد چاڈ پر قبضہ کرنا تھا کہ وہاں سے سوڈان کے جنوبی علاقہ پر قابض ہو سکیں۔ اس ملک کو محض باربرداری کے لیے استعمال کیا گیا۔ فوجی حکام کو ایک ایک پڑاؤ دے دیا گیا تھا اور وہ اپنے علاقے سے سامان آگے بھجوانے کے ذمہ دار ہوتے تھے۔ انہوں نے وسطی افریقہ کے باشندوں کو جبراً سامان ڈھونے کے لیے اکٹھا کرنا شروع کیا۔

یہی نہیں کہ وہ اپنے علاقے کی حد تک ہی سامان لے جاتے بلکہ جو ایک بار قابو میں آجاتا اُسے آخر تک پکڑے رکھتے۔ جب لوگ سڑکوں کے اردگرد کے علاقوں سے بھاگ کر جنگلوں میں چھپنا شروع ہوتے تو ان کے خلاف جنگلوں میں مہمیں بھیجی گئیں اور وہاں سے زبردستی پکڑ کر لائے جاتے۔ اکثر سامان ڈھوتے ڈھوتے مر گئے اور اپنے قبیلوں تک واپس نہ پہنچ سکے۔ جب سوڈان کی مہم ترک کر دی گئی تو یہاں کا نظم و نسق فوجی عہدیداروں کے ہاتھ میں دے دیا گیا۔ اور اس ملک کی بہتری کی طرف کسی نے توجہ نہ دی۔"

مصنّف تذکرہ افریقہ یہ رُوداد بیان کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ جس ملک کو وہاں فرانسیسی ہائی کمشنر کا سکرٹری سب سے زیادہ مظلوم بتائے اُس کی حالت کس درجہ ناگفتہ بہ ہوگی۔

اسی کا نتیجہ ہے کہ اگست ۱۹۶۰ء میں جب چاڈ آزاد ہو کر مستقل جمہوریہ بنا تو اس ۹۴ فی صدی مسلم اکثریت کے علاقے کی حکومت عیسائیوں کے ہاتھوں میں آئی اور ایک عیسائی ایم تومبلبائے اس کا صدر و وزیر اعظم قرار پایا۔ مسلمانوں کو اس میں ثانوی حیثیت ملی اور جب انہوں نے اس صورتِ حال کو بدلنے کی کوشش کی تو طاقت سے ان کو کچلا گیا، کیونکہ فوج اور نظم و نسق پر بہت بڑی حد تک عیسائیوں کا قبضہ تھا۔ مارچ ۶۳ء میں ایم تومبلبائے نے وزیر خارجہ خیر اللہ اور وزیر عدل علی کھوسو کو ان کے عہدوں سے برطرف کر دیا، اور کچھ مدت بعد متعدد بڑے بڑے مسلمان لیڈروں اور عہدہ داروں کو قید کر دیا۔ پھر دستور کو منسوخ کر کے ایمرجنسی کا اعلان کیا اور مئی ۶۳ء میں ایک خاص عدالت ان ملزموں پر مقدمہ چلانے کے لیے مقرر کی جس نے بند کمرے میں اس کی سماعت کی۔ ۲۴ جون کو اس عدالت نے ابونصر (سابق وزیر داخلہ) اور ڈاکٹر بونو کو موت کی سزا، اور باقی ۱۷ مسلمان اکابر کو ۱۵ سے ۲۰ سال تک قید کی سزا سنائی جن میں نیشنل اسمبلی کے صدر محمد عبدالکریم بھی شامل تھے۔ ستمبر ۶۳ء میں چاڈ کے دارالسلطنت لامی میں سخت فسادات ہوئے جن میں بہت سے آدمی مارے گئے اور مسلمانوں کی جدوجہد اس عیسائی اقلیت کے اقتدار سے نجات پانے کے لیے بڑے پیمانے پر شروع ہو گئی جس کا سلسلہ اب تک جاری ہے۔